قاری ظہور رحیم (ضلع رحیم یار خان)

شاہ جی، ایک متحرک شخصیت

قافلے باد بہاری کے جدھر جاتے ہیں
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی نکھر جاتے ہیں

ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر شریعت کے بیان و تقریر میں تاثر کا سبب ان کا روحانی تزکیہ بھی تھا کیونکہ انہوں نے عنفوان شباب میں سلوک و طریقت کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔ اور سرزنش نفس کے لئے دو دو سال تک متواتر روزے رکھے۔ چھے چھے گھنٹے میں قرآن مجید ختم کیا۔ شب زندہ داری کا یہ عالم تھا کہ خود فرمایا کرتے تھے میں نے ستاروں سے بازی لگا دی تو انہیں ہرا دیا۔ جب ریاضت طبیعت پر غالب آجائے تو پھر زبان کا رس سر آفرینی کا کام کرتا ہے۔ زمین کی وسعتیں اس کے آگے سمٹ کر رہ جاتی ہیں اور فضا پر اس کی حکمرانی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ہم نے بارہا محسوس کیا کہ جب امیر شریعت کی خطابت زور پر آتی تو زمین اور آسمان کے درمیان سکوت کا عالم طاری ہو جاتا اور کائنات کا ذرہ ذرہ جھومتا نظر آنے لگتا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریز نے ہندوستان پر رولٹ ایکٹ رائج کیا تو ملک میں نفرت و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ مزید غیض و غضب کا سبب بنا۔ مسلمانوں میں تحریک خلافت نے سر اٹھایا۔ ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج کی بنیاد ڈالی گئی۔ مولانا داؤد غزنوی نے اس موقعہ پر نہایت جسارت سے کام لیا اور انگریز کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اسی اثناء میں مولانا داؤد غزنوی نے امیر شریعت کو اپنا ہم خیال بنا کر آمادہ احتجاج کیا۔ یہاں طبیعت پہلے ہی سے معرکہ حق و باطل کے لئے تیار تھی۔ فوراً سیاسی خطیب کی حیثیت سے میدان عمل میں آگئے۔ ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا اور انگریز کے خلاف ایسی مدلل اور ولولہ انگیز تقاریر کیں کہ ظالم کے ایوان استبداد میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ آپ نے عمر عزیز کا ہر لمحہ استخلاص وطن کے لئے وقف کر دیا۔ ان کا ایک جملہ ہمیشہ احباب کے درمیان گھومتا رہا ہے۔ وہ زندگی کی تقسیم پر فرمایا کرتے تھے۔

"کچھ ریل میں کٹ گئی اور کچھ جیل میں کٹ گئی"

عقیدہ کے لحاظ سے امیر شریعت حنفی مسلک کے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اسلاف سے انہیں والہانہ عقیدت تھی نہ تو کٹر وہابی تھے اور نہ روایتی صوفی۔ وہ تصوف کو اسلام کی جزو سمجھتے تھے۔ اور ہر سلسلے کے بزرگوں سے انہیں قلبی ربط تھا۔ قدوۃ السالکین حضرت مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ گولڑہ شریف سے بیعت تھے۔ ان کے وصال کے بعد اپنی روحانی لذتوں کو برقرار رکھنے کے لئے حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کر لی۔ اس طرح سے امیر شریعت کی زندگی دو کامل بزرگوں کے درمیان بسر ہونے لگی۔ اور یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ امیر شریعت کی زندگی مجموعہ اضداد تھی۔ ملنگوں میں ملنگ خطیبوں میں خطیب۔ عالموں میں عالم درویشوں میں درویش اور سیاست دانوں میں غضب کے سیاست دان۔ ان کی محفل میں جب بھی کسی کو بیٹھنے کی سعادت ملی تو وہ پکار اٹھتا

پر تو منت نہ کنجد در زمین و آسماں
اندروں خانہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

محفل کو ہمیشہ کشت زعفران بنا دیتے۔ مستقد مین اساتذہ کا کلام ازبر تھا۔ فارسی عربی اور اردو کے اشعار اس سلیقہ سے ادا کرتے کہ جاہل سے جاہل انسان بھی مفہوم و معنی پانے میں دقت محسوس نہ کرتا۔ اور ہر طرح کے طبائع کو لطف اٹھانے کا موقع ملتا۔ ان کی محفل میں امیر و غریب کے ساتھ برابر کا سلوک کیا جاتا۔ اور ہر ایک یہ خیال لے کر اٹھتا کہ امیر شریعت میرے ہیں گویا وہاں خلوص و محبت کے ایسے گلدستے تیار کئے گئے تھے کہ جن کی مہک اور خوشبو سے ہر طبقہ کے لوگ فیض یاب ہوتے۔ امیر شریعت حزن و یاس کے عالم میں بھی ہمیشہ خندہ پیشانی سے رہے۔ اور ہر مصیبت کو اس طرح لبیک کہا کہ شاید ان کی آغوش میں آکر پیغام مسرت و رحمت بن گئی ہے۔ ان کا اگر کوئی کمزور پہلو تلاش کیا جائے تو اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ وہ حسن کے فریفتہ تھے۔ حسن کائنات کی جس چیز میں بھی انہیں نظر آتا وہ اس پر وارفتہ ہو جاتے۔

ناصح کو بلاؤ میرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اس نے محبت کی نظر سے

امیر شریعت کو تدبر فی القرآن کا ملکہ ازل ہی سے ودیعت ہوا تھا۔ زندگی بھر مسائل مختلفہ پر قرآن مجید کی آیتیں تلاش کرتے رہے۔ اور اس کی تائید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آئمہ کبار کے حالات جمع کرنے میں لگے رہے۔

لطیفہ بازی اور برجستہ گوئی میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ جب خطابت کی سحر آفرینیوں کا جلوہ دکھاتے تو جم غفیر کو آہ و بکا، نالہ و فریاد پر مجبور کر دیتے اور پھر اسی لمحے میں ظرافت کے ایسے پھول بکھیر دیتے کہ تمام کا تمام مجمع ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

ہر علاقہ کی زبان پر انہیں تصرف و تبحر تھا۔ اور ہر علاقہ کے اخلاق و عادات سے بھی کماحقہ واقف تھے۔ جہاں گئے لوگوں نے آنکھیں بچھا دیں۔ لیکن اپنے دادا جان اور والدہ ماجدہ کی سنت کے مطابق بے انتہا بے نیاز تھے کسی سے کوئی چیز لینے کے روادار نہ تھے۔ البتہ اپنے مخلصین کے تحفے قبول فرماتے تھے۔ سادگی کا یہ حال تھا کہ بقول اختر الآبادی۔ "غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ گھر میں رونق افروز ہوئے تو ہر کسی کی مزاج پرسی فرمائی۔ میری بیوی نے عرض کیا ابا جان کھانا تیار ہے۔ یہاں تناول فرمائیں گے یا دیر پر۔ فرمایا بیٹی تمہارے پاس چٹائی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہیں بیٹھ کر کھالوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ بین الاقوامی شہرت کا وہ خطیب جو ہر نظر میں محبوبیت کا درجہ رکھتا ہو جس کی توجہ کا متمنی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس سادگی کے ساتھ ایک غریب انسان کے ہاں تلطف آمیزیاں فرما رہا ہو کہ جس کی مثال آج ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔ میری بچی عطیہ بتول ان دنوں کوئی سال دو سال کی ہو گی۔ آپ کے سامنے کھیل رہی تھی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔ میں نے عرض کیا حضرت اس نے اگر پیشاب کر دیا تو آپ کو زحمت ہو گی۔ فرمایا بابو تمہیں ان کی عظمت کا اور عزت کا کیا پتہ (میرے میاں) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا مقام پوچھو۔ میرا بھانجہ حبیب

الرحمٰن سولنگی آپ کا مرید تھا۔ زندگی کی ۱۹ ویں بہار دیکھ رہا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا اسیر شریعت پہلے ہی سے اس کی علالت پیہم کا علم رکھتے تھے۔ میں نے اس کے انتقال کی اطلاع کی تو بہت زیادہ محزون خاطر ہوئے اور جواب میں صرف یہ شعر لکھ دیا

گر پیر نودسالہ بمیرد عجبے نیست
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

پھر ملاقات پر کچھ ایسے انداز میں اظہار تعزیت فرمایا کہ جاتا ہوا صبر پھر لوٹ آیا" لاریب یہ کہنا پڑے گا کہ اسیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی ذات میں انسانیت کا احترام اور دوستوں، عزیزوں کی پریشانیوں کا دکھ درد بدرجہ اتم تھا۔ وہ جب بھی کسی کو آزردہ خاطر دیکھتے تو مضطرب ہو جاتے۔ اس معاملہ میں ان کا یہ نظریہ تھا۔

صدیوں کی جان درد کا قالب دیا مجھے
جو کچھ دیا کسی نے مناسب دیا مجھے

حالات کے خاکے بتلاتے ہیں کہ اسیر شریعت کے نظریات میں پختگی اور اصول کی پاسداری کا لحاظ نہایت ضروری تھا۔ ان کے سلسلہ مودّت وارادت میں جو بھی ایک دفعہ منسلک ہو گیا وہ عمر بھر کے لئے انہی کا ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی اسیر شریعت سے وابستہ رہے ہیں جنہیں ان سے سیاسی اختلاف تھا۔ مگر تعلقات میں کبھی کوئی فرق نہ آنے پایا۔ یہ اس لئے کہ وہ ایک مومن کا ایمان اور مسلمان کا اخلاق رکھتے تھے۔ ان کا دل ہر طرح کی گرد کدورت سے صاف تھا۔ علامہ اقبال مرحوم سے دلی تعلق پیدا ہوا تو ہمیشہ اس کے احترام کا خیال رکھا۔ جب کبھی ان کے ہاں جاتے تو راز و نیاز کی باتیں ہوتیں ان کی سنتے اور اپنی سناتے۔ وہ کوئی تازہ نظم سناتے تو حضرت اسیر شریعت داد دیتے۔

بڑی ہستیوں کے بارے میں ان کی رائے اٹل ہوتی گاندھی جی کو سیاست کا مہاتما مانتے۔ پنڈت موتی لال اور سی آر داس کو پکا نیشلسٹ مالویہ جی اور ولبھ بھائی پٹیل کو کٹر ہندو، مولانا آزاد کو علم کا بحر بیکراں، جواہر لال نہرو کو ایک سیاسی انسان، مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کو تقویٰ و طہارت کا مجسمہ، مولانا مفتی کفایت اللہ کو وقت کا ابو حنیفہ سمجھتے تھے۔

شاہ اسماعیل شہید رحمتہ اللہ کو برا کہنے والوں کے متعلق فرماتے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے تاکہ وہ شاہ اسماعیل شہید کے مقام کو پہچان سکیں۔ صاحب زادہ طاہر محمود صاحب گو بریلوی جو طبقہ بریلویت سے مانوس ہیں ملتان میں حضرت امیر شریعت سے اس ارادے کے ساتھ ملنے گئے کہ اسماعیل شہید اور تقویتہ الایمان کے بارے میں ان سے استفسار کیا جائے۔ چنانچہ جب امیر شریعت کے ہاں پہنچے تو آپ نے حسب معمول مزاج پرسی فرمائی۔ صاحبزادہ طاہر محمود صاحب سے نہایت ہی محبت سے پیش آئے اور فرماتے رہے کہ آپ خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ چاچڑی کی نسل سے ہیں اس لئے مجھ پر احترام کرنا واجب ہے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں بات چھڑ گئی تو الماری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس سے کتاب منصب امامت نکال لاؤ کتاب لائی گئی آپ نے اس کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی جو

انبیاء نوع دیگراند کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر فرمایا۔ صاحبزادہ صاحب منصب امامت کی زبان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقویۃ الایمان کی عبارت شاہ اسمٰعیل شہید کے قلم کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ منصب امامت اور تقویۃ الایمان کی زبان میں بیان واندازکا تضاد ہے۔ حضرت امیر شریعت کے اس نظریہ نے صاحبزادہ موصوف کے دل میں ایسا گھر کیا کہ وہ آج تک شاہ اسمٰعیل شہید کے بارے میں رطب اللسان ہیں اور حضرت بخاری کے مدح خواں۔

اسلام پور تحصیل لیاقت پور میں اہل سنت وشیعہ حضرات کی ہمیشہ سے مذہبی چپقلش رہی تھی۔ جانبین سے مناظرہ مباحثہ اور مجادلہ کی سال بہ سال تیاری ہوتی رہتی۔ جلسہ منعقد ہوتا تو دونوں طرف کے علماء اپنے اپنے پنڈال میں ایک دوسرے کی تردید کرتے اور زور خطابت سے اپنے دعوی کو سچا دیکھانے کی کوش کرتے۔ حضرت امیر شریعت اہل سنت کے جلسہ میں تشریف لائے تو منتظمین جلسہ سے کہا میاں اس طرح سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی پر حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ بلکہ ضد اور مخالفت کو راہ ملتی ہے۔ آپ کی تقریر کے وقت کا اعلان ہوا تو سنی اور شیعہ دونوں جلسہ گاہ میں آموجود ہوئے۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔ میں جنگ لڑنے نہیں آیا اور نہ ہی مناظرہ ومباحثہ کا قائل ہوں۔ میں برہان ودلائل کے زور سے کسی کو کوئی بات منوانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ شیعہ حضرات سے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ چار آدمی اپنی طرف سے ایسے تیار کریں جو صالح فطرت ہوں۔ میں ان کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کو تیار ہوں۔ وہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آستان مقدس پر عرض کیا جائے گا کہ حضور اصحاب ثلاثہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرما دیں۔ اگر حضور نے جواباً فرمایا کہ یہ میرے ہیں تو پھر تمہیں بھی ان پر ایمان لانا پڑے گا۔ اور اگر حضور نے کوئی جواب مرحمت نہ فرمایا تو پھر میں تمہارا ہی عقیدہ و مسلک اختیار کر لوں گا۔ حضرت امیر شریعت کا یہ فرمانا تھا کہ جلسہ گاہ کی فضا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی اور اس کا یہ اثر مرتب ہوا کہ پھر کبھی مناظرانہ انداز میں وہاں پر جلسے و جلوس منعقد نہ ہوئے۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر نے ان کے عقیدہ کو بھی صاف کر دیا جو کہ بعض لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہا تھا شاہ جی حیات انبیاء کے قائل تھے یا نہیں بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ جن لوگوں کو اسلاف دیوبند سے گہرا اور قریب کا واسطہ ہے وہ حیات انبیاء کے منکر ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ علمائے دیوبند کا ہر فرد گرامی حیات انبیاء کا قائل ہے اور یہ عقیدہ حضرات دیوبند کے نزدیک اصول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بانئ دارالعلوم دیوبند سے لیکر مہتمم دارالعلوم قاری محمد طیب کی ذات تک اس بات کے قائل ہیں کہ حضور پر نور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم روضہ اطہر میں حیات حسی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ نے تو ایک مکتوب میں زیارت قبر نبوی کے متعلق حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو مرجوع قرار دیتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے۔ کہ مدینہ منورہ کی حاضری محض سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہیئے۔ آپ کی حیات مطہرہ نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام مومنین اور شہداء کو حاصل ہے بلکہ بہت سے وجوہ سے اس سے بھی قوی۔ آپ

سے توسل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا بلکہ اس سے برزخی زمانہ میں بھی کیا جانا چاہیئے۔

یہی بات تھی کہ حضرت امیر شریعت وثوق کامل کے ساتھ یہ اعلان فرما رہے تھے کہ اصحاب ثلاثہ کے متعلقین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ استفسار کرلینا چاہیئے تاکہ حقیقت کا اصلی پہلو واضح ہوسکے۔ چونکہ حیات انبیاء کے عقیدہ کا اجمالاً ذکر چھڑ گیا تھا اس لئے اس کی تفصیل پر چند سطور لکھنے پڑے ورنہ ہمارا موضوع صرف حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کے صفات و کردار کا ذکر کرنا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصیت کے ساتھ نوازا تھا۔

یوں تو اس دنیا میں بہت سے مقرر و خطیب نامور حیثیت سے رونما ہوئے۔ لیکن امیر شریعت کا مقام کچھ اور نوعیت کا تھا۔ وہ خطابت کے وقت موافق و مخالف کو انگشت بدانداں کر دیتے اور دلوں کی بازی اس طرح سے جیت لیتے کہ کسی کو مجال اعراض و انکار نہ ہوتی۔ انگریزی سامراج کے خلاف ان کی خطابت زوروں پر تھی۔ سکھر میں احرار کانفرنس کے موقع پر رات کے دس بجے تقریر کا آغاز ہوا۔ حکومت کا ٹوڈی طبقہ اس تاک میں بیٹھا تھا۔ کہ شاہ جی کوئی نامناسب جملہ استعمال کریں تو حشر بپا کیا جائے۔ آپ نے لہجہ کو ذرا تلخ کرتے ہوئے فرمایا جو استخلاص وطن کا حامی نہیں وہ پلید و ناپاک جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ مخالف طبقہ نے پنڈال کو سر پر اٹھالیا۔ لیکن اس باوقار خطیب نے نہایت جلال کے ساتھ لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر جمال لیا۔ کانفرنس کی فضا میں کوئی تغیر نہ آنے دیا۔ آواز میں اس وقت بجلی کی سی کڑک تھی۔ للکار کر فرمایا "برطانیہ کے سگان دم بریدہ غور سے سنو۔ تمہارے آقا کو یہاں سے بستر گول کرنا پڑے گا۔ اور میں پھر کہتا ہوں کہ جو وطن کی آزادی کا علمبردار نہیں وہ پلید و ناپاک جانور سے بھی بدتر ہے۔"

سبحان اللہ یہ آواز ایک ہادی کی گرج سے کم نہیں تھی۔ سارے پنڈال پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور امیر شریعت کی صداقت آفرین اور بیباک صدا دلوں کے قفلے فتح کر رہی تھی۔ کلام اللہ کی آیت پہ آیت استدلال کے طور پیش فرما رہے تھے۔ رات گزرتے کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ صبح پانچ بجے جب مؤذن نے اذان دی تو حضرت امیر شریعت نے یہ فرماتے ہوئے تقریر ختم کی افسوس کہ

مؤذن اذان بے ہنگام برداشت

امیر شریعت کی خطابت میں مفہوم قرآن کا بڑا دخل تھا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے تدبر فی القرآن کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ کلام اللہ سے دین و دنیا کی ہر شے تلاش کر لیا کرتے تھے۔

پچھلے اوراق میں بیان کیا گیا ہے کہ امیر شریعت کو میدان سیاست میں لانے والے مولانا داؤد غزنوی تھے۔ انہوں نے حضرت امیر شریعت کی انقلاب آفرین فطرت کو خوب ابھرنے کا موقعہ دیا۔ آپ کا طوطی بولنے لگا۔ مولانا ظفر علی خان، مولانا داؤد غزنوی، چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور مولانا مظہر علی اظہر رحمہم اللہ نے ۱۹۲۹ء کو جماعت احرار کی بنیاد ڈال کر پنجاب کی سیاسی زندگی کو بیدار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور حضرت امیر شریعت کو احرار کا پہلا صدر منتخب کیا۔

احرار ذہناً کانگریس کے ساتھ تھے۔ اس لئے سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عرصہ میں

انہوں نے ہندو ذہنیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس لئے احرار نے جولائی ۱۹۳۱ء کو پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی صدارت میں منعقد کی اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ اسپر ہندو پریس آتش زیر پا ہو گیا۔ اور احرار پر کانگریس سے باغی ہونے کا الزام تراشنا شروع کر دیا۔ چونکہ احرار ہندو ذہنیت سے باخبر ہو گئے تھے۔ اس لئے دوبارہ ان کے ساتھ شریک کار نہ ہو سکے۔ جماعت احرار پورے اخلاص سے کام کرتی رہی اور ملک کے مشکلات کے حل کی تدبیریں سوچتی رہی۔ امیر شریعت کا وجود سراپا احرار تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔ اللہ کا نام لے کر میدان عمل میں کود پڑتے۔ پنجاب کے رگ و پے میں طلب آزادی کا خون دوڑ گیا۔ امیر شریعت جہاں بھی جاتے لوگ ان کی راہوں پر پلکیں بچھاتے۔ وہ قرآنی مغز کے ساتھ عوام کو دین و سیاست کی پر پیچ راہوں سے آشنا فرماتے۔ مسلمان کو ان کے مقام سے باخبر کرتے۔ اور بدعات و رسومات کے جادو کو توڑنے کے لئے قرآن حکیم کے محرب نسخے بتاتے۔ آپ کے اس طرز تبلیغ نے علماء کے دلوں میں آپ کا احترام پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ اس بات کے معترف تھے کہ جو کام ہم سے نہ ہو سکا اس کو حضرت بخاری کی مجاہدانہ روش اور مخلصانہ کاوش نے بدرجہ احسن انجام دیا ہے۔ یہی تاثر تھا کہ محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے برصغیر ہندوستان کے پانچ سو جید علماء و صلحاء کی معیت میں حضرت امیر شریعت کے ہاتھ پر سیاسی و دینی امارت کے لئے بیعت جہاد کی۔ اس طرح سے آپ علماء ربانیین اور صلحائے کاملین کی نظر میں امیر دین و محبوبیت کے درجہ میں آ گئے۔ اور مسلم قوم کا درد پہلو میں لیکر قریہ قریہ اور بستی بستی پھرتے رہے۔ بے علم مسلمانوں کو صرف السلام علیکم سکھانے میں کئی برس لگا دیئے۔ تاکہ اسلامی معاشرہ اصول دین سے واقف ہو سکے۔ قوم کو عریانی و بے حیائی میں مبتلا پایا تو صرف اس موضوع پر مہینوں بولتے رہے حتیٰ کہ بیت الخلاء تک کے آداب سکھا دیئے۔ حسن اخلاق اور مواخات کے رشتوں کو جوڑنے کے لئے پند و نصائح کے باب کھول دیتے تو سخت سے سخت دل انسان بھی موم کی طرح پگھل جاتا۔ جاہلانہ رسوم و رواج کو نیست و نابود کیا اور عقائد باطلہ کے شجر خبیث کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔ لوگوں کی گالیوں کا جواب ہمیشہ دعا اور طلب ہدایت کے رنگ میں دیا۔ اپنوں کو گود میں بٹھایا تو غیروں کو گلے لگایا۔ ہر ایک کے حق میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی چاہی۔ اور ہر کسی سے بے لوث محبت کی۔ بہت سی ماؤں کے بیٹے، بہنوں کے بھائی، چھوٹوں کے ابا اور بڑوں کے رازداں تھے۔

اپنے ساتھیوں کی ہمیشہ عزت کرتے اور عوام کے سامنے انہیں اونچا دکھاتے۔ جن جن گھرانوں سے انہیں خصوصی تعلق ہو گیا تھا۔ ان کے حالات سے باخبر ہونے کی کوشش کرتے اور ان کے اعزاز و تکریم کا پورا خیال رکھتے۔

سراٹیکی علاقے کا عمومی ذہن بدعات و رسومات کا دلدادہ اور غلط طریق پر تصوف کے استعمال کا عادی ہے۔ حضرت امیر شریعت نے قرآن و سنت کی روشنی میں جب یہاں تبلیغی دورہ کیا تو ایک طبقہ نے ان کے خلاف وبایت کا طومار کھڑا کر دیا۔ یہ بات ان کے کانوں میں پہنچی تو فرمایا۔ "میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور نہ کوئی نیا الزام ہے۔ قوم کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ہمارے واعظ اور مقرر ہی کچھ اس طرح کے

واقع ہوئے ہیں کہ وہ قوم میں رسومات بد پھیلا کر اپنی من مانی کرانا چاہتے ہیں۔ اور مجھ سے اسے دور رکھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ناامید نہیں ہوں۔ قوم میں اب بھی صلاحیت باقی ہے"۔ پھر اس طغیانی کے ساتھ اس علاقے کا دورہ کیا کہ ہر ہر گھر میں امیر شریعت کی آواز پہنچی۔ اور لوگوں نے دین کی سچی و صحیح معرفت حاصل کر لی۔

خانپور شہر میں میراث پر تبلیغ کی تو رات ہی رات میں ایسے ایسے گھرانوں نے اپنے مال کو شرعی طور پر تقسیم کر ڈالا۔ جن کے خاندانی روایات میں اس طرح کی تقسیم ورثہ کا ذہن ہی نہیں تھا۔

وہ جس موضوع کو اپنی خطابت میں چن لیتے اس پر اس قدرت کے ساتھ براہین و دلائل لاتے کہ سامعین کو بجز تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہ ہوتا۔ اور نہ ہی کسی کو مزید سوچنے کی توفیق ملتی۔ ان کی خطابت میں آواز خوش سونے پر سہاگے کا کام کرتی جو ذہن کے بالاخانوں سے نکل کر دل کی گہرائیوں تک جا پہنچتی۔

انگریز دشمنی ان کا ایمان تھا۔ وہ کسی ایسی طاقت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس نے چراغ مصطفوی کے گل کرنے کی جدوجہد کر رکھی ہو۔ وہ ہمیشہ دشمنان دین سے نبرد آزما رہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک کی دوڑ لگائی کوئی ایسا گاؤں اور شہر نہ تھا جس نے امیر شریعت کی درد بھری پکار نہ سنی ہو۔ اور ان کی ایمان افروز تقریر سے بہرہ اندوز نہ ہوا ہو۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی و شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہا اللہ نے ایک راستہ دکھایا تھا میں اس پر چل کر اپنی آخرت کا سامان بنا رہا ہوں۔

بہاول پور جب نواب صاحب بہاول پور کے زیر نگیں تھا تو وہاں پر سیاسی مقررین کے خطاب کرنے کا کم موقع ملتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے قوانین ہی کچھ ایسے تھے۔ لوگوں نے دوڑ دھوپ کر کے حضرت امیر شریعت کے داخلہ کی اجازت لی۔ آپ تشریف لائے۔ عید گاہ میں جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ حد نظر تک لوگوں کا ہجوم تھا تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ آپ کلہاڑی ہاتھ میں لئے سٹیج پر تشریف لائے۔ لوگوں نے دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ استقبال کیا۔ نعرہ تکبیر سے فضا گونج اٹھی۔ خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔ میں یہاں سیاسی تقریر کرنے نہیں آیا میں نواب بہاول پور اور ان کے خاندان کا احترام کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ریاست بہاول پور کو سرسبز و شاداب رکھے۔ مجھے یہاں پر دین کی خوشبو آتی ہے۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ میرے داخلہ پر پابندی صرف اس جرم کے عوض ہے کہ میں ۱۸۵۷ء کے خونی واقعات پر پردہ ڈالنے والوں کو صرف اس لئے غدار کہتا ہوں کہ وہ اسے غدر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی شہزادوں کا خونی گیلی پولی کے مقام پر دروازہ پر لٹکایا جانا۔ گیلی پولی کے مقام پر ٹوانوں اور نونوں وغیرہ کی مصطفیٰ کمال کے خلاف نبرد آزمائی کرنا۔ قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفتہ المسلمین کی بیٹی کو گھسیٹنا، سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بغداد پر گولہ باری کرنا اور غلاف کعبہ کا جلانا۔ حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا۔ مہدی سوڈانی کا خرطوم میں سولی پانا وغیرہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ اور انگریز کی ریشہ دوانیوں سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرتا ہوں۔ اگر واقعی تمہارے نزدیک میرا یہ جرم باعث گرفت ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ایسے جرم کے ارتکاب میں

ایمان کی سلامتی اور دین کا استحکام پاتا ہوں۔ پھر کیا تھا۔ بخاری زندہ باد کے نعروں سے بہاول پور کا طول و عرض گونج اٹھا۔ اور پیر و جوان کے دل ان کی صداقت پر ریجھ گئے۔ حضرت امیر شریعت کی بے لوث خدمت اور دین کی دردمندی کا علم نواب صاحب بہاول پور کے بچا حاجی بلخ شیر کو ہوا تو انہوں نے اس بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہ نواب صاحب پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ آپ کو اپنے یہاں تبلیغ کے لئے دعوت دی۔ جو منظور کر لی گئی۔ حاجی بلخ شیر مرحوم کے مکان کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ جہاں ان دنوں بغیر اجازت داخلہ ممنوع ہوا کرتا تھا۔ لیکن حضرت امیر شریعت کی تشریف آوری پر یہ پابندی اٹھا دی گئی۔ لوگوں نے نہایت خلوص و محبت کے ساتھ یہاں پر بھی اپنے خطیب کا استقبال کیا۔ رات کے سناٹے میں جب امیر شریعت کی قرأت قرآن نے پھول بکھیرنے شروع کئے اور لحن داؤدی اپنی پوری جولانی پر آیا تو ستاروں نے بھی جھک جھک کر سلام کیا۔ فضائے آسماں کا ذرہ ذرہ رقص کرتا ہوا نظر آنے لگا۔ آپ نے نہایت جرأت مندانہ انداز کے ساتھ امراء کے عیش پسندانہ ٹھاٹھ و رویہ پر تنقید کی اور غرباء پر ان کے ظلم و ستم کا شکوہ کرتے ہوئے اُس زندگی کا خاکہ کھینچا جو اس دنیا کے چھوڑ جاتے ہی ہر انسان پر وارد ہوتی ہے۔ پھر کیا تھا ہر کسی کے چہرے پر ندامت و تاسف کے آنسو جاری تھے اور بے ثباتی دنیا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا تھا۔ دلوں پر ایسی کاری ضرب لگ چکی تھی کہ ہائے اور وائے کے سوا کوئی جملہ زبان پر آتا ہی نہ تھا۔ اس تقریر میں توحید باری تعالیٰ، توصیف رسالت و ختم نبوت اور اصلاح معاشرہ پر بہت زور دیا گیا۔ حقوق العباد کا لحاظ اور اس کی تلفی پر نقصان و گرفت کا اندیشہ راعی و رعایا کے تعلقات پر سیر حاصل تبصرہ غرض کہ تبلیغ حقہ کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ رات کے آخری حصہ تک تقریر جاری رہی لیکن کسی کی آنکھ پر نیند کے خمار کا اثر نہ پایا گیا۔

جن لوگوں نے امیر شریعت کے جمال صورت کو دیکھا اور ان کی تقاریر کو سنا ہے وہ اس سے متفق ہوں گے کہ جب وہ سٹیج پر جلوہ فرما ہوتے اور خطابت اختیار کرتے تو ہزاروں کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوتا جو اپنے دل و دماغ کو کسی دوسری طرف منعطف کر سکتا۔ خطابت کے دوران وہ جلال و جمال کا مرقع بن جاتے ان کا چہرہ آفتاب کی مانند چمک اٹھتا۔ جو ہزاروں انسانوں پر اپنی دلربائی کی کمند ڈال دیا کرتا تھا۔

ان کی مسکراہٹ محزون و غمناک دلوں کے لئے مسرتوں کا پیغام بن جاتی اور وہ جس طرف نگاہ پر لطف اٹھا کر دیکھ لیتے وہاں بہاروں کے سامان جمع ہو جاتے۔

وہ مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
دیکھا نظر اٹھا کے تو گلشن بنا دیا

بقول مولانا ابوالکلام آزاد کہ "کمال مرتبہ حسن اور خوبروئی یہ ہے کہ صرف دوستوں ہی کی نظریں نہ اٹھتی ہوں بلکہ ایک عیب چیں دشمن بھی دیکھے تو بے اختیار ہو کر پکار اٹھے کہ دل ستاں صورتیں اور صبر آزما چتونیں ایسی ہوتی ہیں۔" چنانچہ ہمارے دلربا خطیب کی شخصیت میں بھی دل ستانی کے تمام سلیقے موجود تھے۔ سکندر وزارت کے عہد میں آپ راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں قید کر دیئے گئے۔ جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ کرنل ہاورڈ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ باوجودیکہ اسے یہ علم تھا کہ اسیر شریعت ہمارا کٹر دشمن ہے۔ لیکن وہ آپ

کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ کو بیڈمنٹن کھیلنے پر آمادہ کیا اور جب تک آپ جیل میں رہے اس کے ساتھ ہر شام بیڈمنٹن کھیلتے رہے۔ اس انگریز نے ایک کتاب "ہندوستان کی یادیں" مرتب کی ہے جس میں وہ امیر شریعت کے بارے میں قلم طراز ہے۔

"جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا ان میں عطاء اللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دلفریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنہیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔

میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں اس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اس اینٹی برٹش ذہن کی باقیات میں سے تھا جنہیں ہمارے بیشروؤں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا"

کسی کی دلفریب اداؤں کا جائزہ لیا ہو تو ان سے پوچھیئے جو ہمیشہ تنقیدی نگاہ سے دیکھتے رہے ہوں۔ اور اس کی خوبیوں اور محاسن کا اپنی تہذیب و تمدن کے ساتھ مقابلہ کرتے گزر گئی ہو۔ انگریز کی تنگ نظری لو ربے انصافی کو کون نہیں جانتا کہ ہوس سلطنت کی خاطر وہ ہر اچھائی سے منہ پھیر لیتا رہا۔ لیکن حضرت امیر شریعت کے محاسن سیرت و صورت کے سامنے وہ بھی تسلیم و رضا کے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور اور آپ کے حسن کا گھائل ہو گیا تھا۔

صحن چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے۔

حضرت امیر شریعت کی طبیعت کا یہ

خاصہ تھا کہ جب بھی آپ جیل کی چار دیواری سے باہر قدم رکھتے تو ان کا جذبہ حریت اور چمک اٹھتا وہ احباب کے جھرمٹ میں نہایت خندہ جبیں نظر آتے اور اپنے ارادوں کی تکمیل کو پھر کمر باندھ لیتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مایوسی گناہ تھی اور بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا خوف و ہراس محرومی ایمان کا سبب تھا۔ وہ باطل کے خلاف ہر طرح کی جنگ لڑنے کو اسلامی شعار بتلاتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے کہ مومن وارث کائنات ہوا کرتا ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

مملکت پاکستان کے قیام کے بعد مرزائیت نے اپنی تبلیغی کارروائیاں تیز کر دی تھیں۔ امیر شریعت اور ان کے رفقاء نے اس پر محاسبہ کیا تو تحریک ختم نبوت کی پاداش میں ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں گرفتار کر لئے گئے۔ ایک سال بعد لاہور ہائیکورٹ نے مرافعہ دائر کرنے پر چھوڑ دیا۔ مئی ۱۹۵۶ء میں آپ کو ملتان کے حدود میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ عمر کے اس آخری حصہ میں امیر شریعت کی قید و

بند مسلمان حکومت کے دور کی پیداوار تھی۔ جس پر ان کے تاثرات کی ترجمانی اس شعر سے ہو سکتی ہے۔

دوستوں سے اسقدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کے ساتھ اگر مرزائیت کے چہرے پر سے پردہ نہ اٹھایا جائے تو بہت سی ایسی حقیقتیں واضح نہ ہو سکیں گی جن کا تعلق دین کے اصول سے ہے۔ اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے کہ جماعت احرار دیگر مسلمان مرزائیت کے خلاف کن وجوہات کی بناء پر تھے۔

مسلمانوں اور مرزائیوں کا باہمی نزاع اس وقت شروع ہوا جب ۱۸۸۰ء میں مرزا غلام احمد نے ملہم من اللہ ہونے کا دعوی کیا اور پھر یکم دسمبر ۱۸۸۸ء کو یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ اس پر بھی انہیں اپنی تکمیل کار نظر نہ آئی تو پھر ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا نعرہ بلند کیا اور ظلی نبی کی اصطلاح ایجاد کی۔ اس دعویٰ کے باوجود بھی تسکین خاطر نہ ہوئی تو نومبر ۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں انہیں یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں مثیل کرشن بھی ہوں۔ اور ہر مذہب کے لئے اوتار بھی۔ دعویٰ نبوت سے پہلے مرزا صاحب عیسائی مشنریوں سے مناظرہ کرنے کے لئے جاتے تو ان کے ساتھ مولوی محمد حسین بٹالوی بھی ہوتے گویا مرزا صاحب سے پہلے کسی کو کوئی تعرض نہ تھا۔ جب انہوں نے خاتم النبیین کی نبوت پر ہاتھ صاف کرنے کی ٹھانی اور اپنے ملہم من اللہ ہونے کے زعم میں مبتلا ہوئے تو وہ لوگ بھی ان سے علیحدہ ہو گئے جو پہلے ان کے ساتھ شریک مناظرہ عیسائیت وغیرہ ہوتے تھے۔ اور مسلمانوں میں ان کے اس دعویٰ نے ہیجان کا عالم پیدا کر دیا۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن خاتم النبیین کی مہر کے توڑنے والے کو کیونکر گوارا کرتے۔ مرزا صاحب کا دعوی نبوت مسلمانوں کے ایمان پر یلغار کے مترادف تھا۔ ہر طبقہ کا مسلمان برافروختہ ہو گیا۔ جوابی کارروائی میں علماء کے فتوے چھپنے لگے۔ سب سے پہلے ۱۸۹۰ء میں لدھیانہ کے علماء نے فتویٰ دیا جن میں مولانا محمد عبداللہ اور مولانا عبدالعزیز مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی پیش پیش تھے۔ پھر آگرہ حیدر آباد اور بنگال کے علماء نے بھی مرزا صاحب کے خلاف فتوے صادر کئے۔ اس طرح سے مرزا صاحب کی نبوت و مہدویت نزاع کا باعث بن گئی۔ لیکن یہ نزاع ابھی تک عام سطح پر نہیں آیا تھا کہ عوام بھی اس سے باخبر ہوشیار ہو جاتے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم مدیر زمیندار اخبار نے اس ضمن میں زور دار مقالے اور نظمیں لکھیں۔ گویا تقریر و تحریر کا کوئی ایسا پہلو نہ تھا جو انہوں نے مرزائیت کو بے نقاب کرنے میں استعمال نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ "ارمغان قادیان" کتاب لکھ کر انہوں نے مرزائیت کے خلاف مستقل مواد چھوڑا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کی پیدا کی ہوئی عوامی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ سیاسی و دینی حلقوں نے بھی مرزائیت کے خلاف جدوجہد کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ چودھری افضل حق مرحوم جو جماعت احرار کے روح رواں اور مخلص ترین رکن تھے۔ نے اپنے احرار رفقاء کو مرزائیت کے خلاف آمادہ پیکار کیا۔ حضرت امیر شریعت پہلے ہی سے شان رسالت پر جان نچھاور کرنا جانتے تھے۔ اور ان کا خلاصہ ایمان بھی یہی تھا کہ عصمت نبی کے تحفظ پر جان کی بازی لگا دینا ہزار سالہ عبادت سے افضل ہے۔ میدان محاربہ میں نکل آئے اور مرزائیت کے تار و پود بکھیرنے لگے۔ ملک کے

چپہ چپہ میں پھرے اور مرزائیت کی اس حقیقت کو بے نقاب کیا۔ جو اصول اسلام کے منافی اور تضاد میں تھی۔ اور یہ بھی ثابت کیا کہ مرزا صاحب کی نبوت حکومت برطانیہ کی مرہون منت ہے۔ اور مرزائی برٹش امپریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔ کیونکہ مرزا غلام احمد کتاب ابریہ کے حاشیہ میں خود لکھتے ہیں۔

"میرے والد کو انگریزی حکام نے خوشنودی مزاج کی چٹھیاں دی تھیں۔ سر لیپل گریفن نے اپنی کتاب رئیسان پنجاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے"

ملاحظہ ہو ریویو آف ریلیجز صفحہ نمبر ۲۱۹ بابت جون جلد ۵ نمبر ۶

امیر شریعت اکثر فرمایا کرتے کہ نبوت کا صحیح معیار معلوم کرنا ہو تو اس کے خاندان کے کوائف پر غور کر لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ نبوت کے لئے جو گھرانا چنا جاتا ہے وہ بھی اسی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جن سے اس کی امتیازی حیثیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ تملق اور غلامانہ ذہنیت سے بالکل مبرا ہوتا ہے۔ لیکن مرزا صاحب کے خاندانی حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کے بزرگوں نے ہمیشہ حکومت وقت کی اطاعت و غلامی میں اپنی زندگیاں بسر کیں۔ عطا محمد مرزا صاحب کے دادا اور ان کا والد گل محمد رام گڑھیہ اور کھنیا سکھ جماعتوں سے لڑتے رہے عطا محمد اپنی جائیداد کھو کر سردار فتح سنگھ اہلووالیاں کی پناہ میں بیگووال چلا گیا جہاں بارہ سال تک مقیم رہا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا محمد کی وفات پر اس کے بیٹے غلام مرتضیٰ اور مرزا غلام احمد کو واپس بلا کر جدی جاگیر کا بہت حصہ واپس دے دیا۔ جب پنجاب کا انگریزوں سے الحاق ہو گیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ لیکن غلام مرتضیٰ اور اس کے بھائیوں کو سات سو روپے بطور پنشن ملتے رہے۔

جب انگریز ملک پر مسلط ہو گیا تو مرزا صاحب کے خاندان نے ان سے بھی اطاعت کا رشتہ قائم کر لیا اور ۱۸۵۷ء کے دوران نہایت وفادارانہ خدمات انجام دیں۔ مرزا غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کئے۔ اس کا بیٹا غلام قادر جو مرزا غلام احمد کا بھائی تھا اس وقت جنرل نکلسن کی فوج میں تھا۔ اس نے ۴۶ نیو انفنٹری سیالکوٹ کے باغیوں کو تہ تیغ کیا۔ جنرل نکلسن نے غلام قادر کو ایک سند عطا کی جس میں یہ لکھا تھا کہ "ان کا خاندان قادیان ضلع گورداسپور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا ہے" یہ سب واقعات سر لیپل گریفین نے اپنی کتاب رئیسان پنجاب میں لکھے ہیں۔

امیر شریعت ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میں ان حالات کی روشنی میں کہتا ہوں کہ مرزا صاحب کی نبوت انگریز کی مرہون کرم ہے۔ اور یہ اس کا خود کاشتہ پودا ہے۔ جو مسلمانوں میں تفریق پیدا کرانے کے لئے کاشت کیا گیا تھا۔ تاکہ ملک کی وحدت فکر پارہ پارہ ہو کر مفلوج بن جائے۔ اس لئے ہم یہ عزم لے کر اٹھے ہیں کہ ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ لیکن کسی باطل مدعی نبوت کے افکار کو ملک میں نہ پھیلنے دیں گے۔ اور ہم ہر اس حکومت کا مقابلہ کرنے کو بھی تیار رہیں گے جو مرزائیت کے نظریات کو پھیلانے کی روادار ہو گی۔

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ اس ایمان افروز جذبے کے ساتھ مرزائیت کے استیصال پر کمر

باندھ رکھی تھی۔ وہ ہر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لیکن مرزائیت کے خلاف ان کی جدوجہد اس وقت بھی قائم رہی جبکہ وہ ذیابیطس و فالج جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ علالت کے ایام میں جن حضرات کو شرف دیدار میسر آیا اُن سے فرماتے کہ "اعضاء جواب دے رہے ہیں تمام وجود باغی بن گیا ہے میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں۔ اب یہ انتقام پر اتر آیا ہے۔ کچھ توشہ آخرت پاس نہیں البتہ ایک چیز پر فلاح آخرت کی امید رکھتا ہوں وہ یہ کہ تمام عمر عصمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ پر صرف کر دی ہے۔ وہ یقیناً موجب نجات اور وجہ عافیت دارین ثابت ہو گی۔

امیر شریعت کی پذیرائی بارگاہ نبوت میں یقینی ہے۔ کیونکہ امیر شریعت کی زندگی کا ہر پہلو احیائے دین وسنت کا آئینہ دار تھا ان کے افعال واقوال کا کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جو اسلام کے جذبہ سے بھرپور نہ ہو۔ وہ کفر کی طاغوتی طاقت سے نبرد آزما رہا تو دین کی خاطر اور حکومت وقت کا باغی کہلایا تو دین کے لئے۔ اس نے اپنی تمام عمر کو مشکلات کے حوالے کیا تو دین ہی کی غرض سے۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بوجھل بیڑیاں گوارا کیں تو دین ہی کی عظمت کے لئے۔ باطل سے لڑا اور لہنوں سے بگڑا تو صرف دین کی خاطر اس نے راحت و آسائش کے تمام شعبے موقوف کر دیئے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر قربان ہوتا رہا۔ اور وہ آخر دم تک عشق کی اس گرمی میں مست و بیخود رہا۔ تو کیا اس ایثار و قربانی کو اس کے حضور پذیرائی کا کوئی درجہ نہیں ہو گا۔ کیا اس کی رحمت اپنے والہ وشیدا کے لئے مقرر نہ ہو گی۔ کیا اس کی مخلصانہ جدوجہد کا کوئی صلہ نہیں ہو گا۔

یقیناً ہو گا وہاں بے انصافی کو راہ نہیں ہے۔ وہاں وابستگان پر رحمت و کرم کی نظر فرمائی جاتی ہے۔ اور خلقت قرب کی نعمتوں سے سرفراز فرما کر اس کے ذکر کو یہ عظمت دی جاتی ہے کہ دوست و دشمن اس کے محاسن کے قائل اور اس کے کردار کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ بہت سی یادیں ایسی ہیں جو موت کے ساتھ دفن ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر جنہیں اس کی مشیت میں زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ مرور زمانہ کے باوجود بھی زندہ رہتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرنے کے باوجود بھی مرنے والا زندہ ہے۔ بظاہر اس وقت امیر شریعت ہم میں نہیں ہیں۔ اور عرصہ ہوا ان کی آواز کے رسیلا پن سے ہمارے کان محروم ہیں۔ اور نگاہ جستجو ہزار سعی و تردد کے انہیں تلاش نہیں کر سکتی۔ لیکن دل کی گہرائیوں اور دماغ کے بالاخانوں پر ان کا قیام ابھی تک ہے۔ وہ نظر نہیں آتے لیکن ان کی رنگینی طبیعت اور پاکیزگی فطرت آج بھی ہماری محافل کو رنگین بنا رہی ہے۔

شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

بزرگان دین کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں دین میں مقبولیت کا درجہ دیا جاتا ہے اور ان کے ذریعہ سے توحید و رسالت کی تبلیغ کا کام لیا جاتا ہے تو وہ حب مال اور منصب وجاہت کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہیں۔ وہ بظاہر دنیا کے مشہور ترین انسانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کی اندرونی زندگی فقر و غنا سے اس قدر مملو ہوتی ہے کہ کوئی اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔

امیر شریعت کی زندگی پر جب غور کیا جاتا ہے اور حالات کے خاکے مرتب ہوتے ہیں تو ہمیں ان میں بھی فقر کی شان اور غنا کی آن معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے سامان دنیا کو کبھی اپنی راحت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کسی سے کچھ لینے کے روادار نہ ہوئے۔ کسی کے ہاں دست سوال دراز نہ کیا۔ فاقوں پہ فاقے ہوئے تو چہرے کی مسکراہٹ اور پیشانی کی تابانی میں فرق نہ آیا۔

متعلقین سے مروت کا ہاتھ کبھی نہ کھینچا۔ جو کچھ موجود ہوتا آگے رکھ دیتے۔ ہمارے دوست اختر الہ آبادی بتلاتے ہیں کہ "میری ہمیشہ چائے سے ضیافت فرماتے۔ ایک دفعہ چائے لائی گئی تو بجائے شکر کے نمک استعمال ہوا۔ میں نے ظرافتاً کہا شاہ جی میں تو پہلے ہی نمک خوار ہوں۔ فرمایا۔ بابو یہ بات نہیں۔ ہفتہ بھر سے گھر میں شکر نہیں ہے۔ اس لئے بلاتکلف نمک استعمال کر رہا ہوں۔ اور دوستوں کو بھی نمکین مزہ سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ پھر نمکینی اور حلاوت پر بات چھڑ گئی تو فارسی اور اردو کے اشعار کے دفتر کے دفتر لگ گئے۔ اور چائے کا ہر گھونٹ نمکینیت میں حلاوت کا ایسا مزہ بن گیا کہ اس کے سرور سے آج بھی روح کو کیف و خمار کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔ اور ساقی کے چل دینے پر بھی وہ تمام لذتیں باقی ہیں جو ان کے ہوتے ملتی تھیں"۔

اگرچہ میکدے سے اٹھ کر چل دیا ساقی
وہ مئے وہ خم وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اللہ اللہ شہرت کا یہ عالم کہ چار دانگ عالم میں دھاک بیٹھ گئی ہو۔ لوگ راہوں پر یوں منتظر کھڑے ہیں جیسے ان کا محبوب ان کے خراب آباد کو اپنی تشریف آرزانی سے آباد کر رہا ہو۔ اور ہر دل سے یہ صدا آرہی ہو۔

بہ تشریف قدوم خود زمانے
مشرف کن خراب آباد مارا

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ امارت کی سب راہیں محدود دولت کے سب دروازے بند تقلید اسلاف میں نان جویں پر گزارا۔ اس پر طرفہ فضیلت یہ کہ ہر سانس میں اطمینان و سکون کی بشارت اصل بات اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن نفوس قدسیہ کو اپنی مودت میں چن لیتے ہیں۔ انہیں طمانیت قلب عطا فرما کر رغبت دنیا سے بے نیاز کر دیا کرتے ہیں۔ اور اس کی توقیر میں لوگوں کے قلوب کو مسخر کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی عظمت اور وجاہت کے سامنے کسی کو مجال انکار نہ ہو۔ دیکھنے والے حضرات ابھی اس دنیا میں باقی ہیں کہ انہوں نے امیر شریعت کے سامنے دوست دشمن کو سرنگوں ہوتے دیکھا ہے۔ اور ان کی دلبری کے گیت گاتے سنا ہے۔

عالۃ الناس سے لیکر عارفین و کاملین تک امیر شریعت کو مقبولیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ ہر ایک کے عزیز اور محبوب تھے۔ اور ہر انسان کے دل میں ان کی محبت تھی۔ لوگ ان کی راہوں پر آنکھیں بچھاتے اور ان کی اداؤں پر دل نچھاور کرتے تھے۔

بیسیوں حضرات کا مشاہدہ ہے کہ سراج السالکین حضرت خلیفہ غلام محمد قدس سرہ العزیز دین پوری کی

خدمت میں جب حضرت امیر شریعت نے حاضری دی تو حضرت خلیفہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی تعظیم میں باوجود ضعف پیری کے بھی سروقد کھڑے ہوگئے اور امیر شریعت کو اپنی دعاؤں و نوازشات خصوصی کا مستحق جانا۔ ایک صاحب دلایت و منبع روحانیت کا امیر شریعت سے اس طرح کا سلوک کرنا اور ان کو دل سے چاہنے کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نظر نہیں آتا کہ حضرت دین پوری رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ معرفت نے ان کی خصوصیات خفی و جلی کو پہچان لیا تھا۔ جس انسان پر عارفین و کاملین کی نظر انتخاب پڑ گئی ہو وہ لاریب امتیاری حیثیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ یہی بات تھی کہ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کامل یقین کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا فضل ہے کہ میری آنکھ کبھی میلی نہیں ہوئی۔ دنیا بھر کی ہو بیٹیاں میری بیٹیاں ہیں۔ میری فطرت سے کسی کی عصمت کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اور نہ ہی مجھ سے خیانت کا ارتکاب ہوا اور نہ ہی میرے ہاتھ سے کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہے۔

امیر شریعت کے اس بیان کی صداقت محقق ہے کیونکہ آج تک موافق و مخالف نے ان کے اس دعویٰ کی تکذیب نہیں کی۔ اور نہ ہی کوئی کر سکتا ہے۔ جس کا دامن طہارت و پاکی کے پانی سے دھلا ہوا ہو اس پر اتہام و الزام کے دھبے کیونکر ہوں اور کسی کو یہ جرأت کیوں ملے کہ وہ آب زمزم کو بدذائقہ اور بدبودار پانی سے تشبیہ دے۔

امیر شریعت کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر قرینہ ان کی پاکیزگی فطرت کا آئینہ دار ہے۔ وہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں ایک پاکباز اور پاک نفس انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی ہمہ گیری اور دلبوئی کا یہ عالم تھا کہ آج تک ہر مقرر و خطیب انہیں کے طرز خطابت کے نقوش کو اجاگر کئے پھرتا ہے۔ اور اپنے تعلق کو ان کے آستان سے وابستہ کرنا اپنی عزت سمجھتا ہے۔ آج کی انجمنیں ان ہی کے سوز عمل کا پرتو اور انہی کے کارہائے نمایاں کا عکس جمیل ہیں۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

ہم اس موقعہ پر اس حقیقت کے اظہار سے بھی خاموش نہیں رہ سکتے کہ امیر شریعت کے ساتھ جن لوگوں کو خصوصی تعلق تھا اور وہ ان ہی کی بدولت پھلے پھولے اور مشہور عالم ہوئے افسوس کہ آج ان میں سے بعض کا مزاج انکسار و اخوت کے جذبہ سے محروم ہو کر رہ گیا ہے وہ امیر شریعت کی ساری تعلیم بھول گئے ہیں اور ان کے اطوار مخلصانہ کو انہوں نے گلدستہ طاق نسیاں بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ حضرت امیر شریعت کے باقیات صالحات اولاد سے بھی کنارہ کشی اختیار فرماتے ہیں۔ حالانکہ وہی اولاد ہے جن سے بخاری کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کا احسان یہ ہے کہ ان کی اولاد میں اپنے اسلاف کے مقام کو محفوظ رکھنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا احساس ہے۔ ہم دلیل کے طور پر ان کے فرزند جلیل فاضل روزگار حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ کو پیش کرنے میں کسی طرح کا تردد محسوس نہیں کرتے وہ اپنے والد محترم کی روایات کو زندہ رکھنے اور ان پر عمل پیرا رہنے کی سعی میں رہتے ہیں۔ اللہ کرے ریاض امیر شریعت کے یہ پھول ہمیشہ

شگفتہ رہیں۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حضرت امیر شریعت کی خطابت شخصیت اخلاق و عادات سے متعلق تھا اور ان کی مجاہدانہ زندگی کے چند ایسے خاکے تھے جو بر عظیم پاک وہند کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب ہم ان کے اس پاکیزہ فکر اور ذوق طبیعت کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے نہاں خانۂ دل سے نکل کر شاعری کے روپ میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا:

ان من الشعر لحکمۃً وان من البیان لسحراً

بعض اشعار حکمت سے مملو ہوتے ہیں اور بعض خطابت جادو گری کا کام کرتی ہے۔

حضرت امیر شریعت کی خطابت کی جادو گری تو مسلمہ ہے۔ لیکن جب ہم ان کی شاعری پر غور کرتے ہیں تو وہ بھی حکمت کے موتی بکھیرنے میں کسی سے کم نہیں ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہیں خطابت کاملہ کے ساتھ شاعری کاملہ بھی ودیعت کیا گیا ہو۔ اور یہ دونوں چیزیں یکجا جمع ہوئی ہوں۔ امیر شریعت کی سخن فہمی اور رغبت ادب کا علم تو ہر کسی کو تھا۔ لیکن بحیثیت ایک شاعر کے انہیں بہت کم لوگ جانتے تھے حتیٰ کہ یہ راز بعض مقربین سے بھی مخفی تھا۔

جب ان کے فاضل فرزند و جانشین سید ابوذر بخاری مدظلہ نے انکا مجموعہ کلام سواطع الالہام کے نام سے شائع کیا تو معلوم ہوا کہ امیر شریعت کی زندگی ابتداً اس طرف راغب تھی گھریلو تعلیم کے ادبی ماحول نے انہیں مجبور سخن گوئی کر دیا تھا انہوں نے اصلاح کلام کی خاطر میر سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم سے رجوع کیا اور مشق سخن جاری رکھی۔ موزئ طبع نے شاعری کے ملکہ پر گل بوٹے لگائے۔ آپ کے دل کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن کر نکلیں۔ جنہیں مولانا محمد دین غریب مرحوم امرتسری نے علم وادب کے صحیح زاویہ کے مطابق ترتیب دیا۔ یعنی بحیثیت استاد فن کے انہیں دیکھا اور پرکھا۔ لیکن امیر شریعت کا یہ ذوق جلوہ آرائیوں سے اس لئے محروم رہا کہ قدرت نے انہیں در حقیقت خطابت قوم کے لئے تیار کیا تھا۔ شاعری کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ البتہ بعض دفعہ شاعری کو یہ عزت ضرور ملی ہے کہ اسے کسی کے اچھے دامن سے وابستہ ہونے کا موقعہ میسر آیا ہے۔ یہی حال امیر شریعت کی شاعری کا بھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے شاعری کو نہیں چنا بلکہ شاعری نے انہیں اپنے لئے منتخب کیا ہے کیونکہ کلام کی بلندی، پاکیزگی اور ترکیب محاورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری ہی کو معراج ترقی کی عزت بخشی ہے کسی کے کلام سے اس کے عقیدہ و حالات اور کوائف کا پتہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے نظریات فطرت کا علم ہوتا ہے اور اس کی طبیعت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

امیر شریعت کے کلام سے بھی ہم ان کے حالات عقائد اور گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیں گے۔ تاکہ ان کی شخصیت کے بعض پنہاں پہلو بھی واضح ہو سکیں۔

تصوف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کسی کا کمال تسلیم کرنے میں اس کے عقیدہ و تصرف پر غور

کرتے ہیں کہ وہ اس منزل میں کس حد تک تحقیقی راستہ طے کر چکا ہے۔ امیر شریعت کا حال ان کے تصوف میں ان کے اس شعر سے معلوم کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ انہوں نے وحدت وجود جیسے مشکل مسئلہ کو نہایت صاف ستھرے انداز میں واضح کیا ہے۔

وحدت بوجد و حالت کثرت در آمدہ
حرکت بجلوہ۔ جلوہ بحرکت درآمدہ

اسی مفہوم کو اور زیادہ صاف کر کے فرمایا

ذروں سے تابہ مہر ستاروں سے تا چمن
عکس جمال یار کی تابندگی ہے دوست

وحدت وجود کا نظریہ بیان کرتے ہوئے امیر شریعت نے نہ تو روش منصور رحمۃ اللہ علیہ اختیار فرمائی ہے اور نہ ہی جاہلانہ وحدت وجود کی بنیاد رکھی ہے۔ بلکہ اس نازک ترین مسئلہ کو ہر طرح کی منطقی و تکلفاتی آلائش سے پاک رکھا ہے تاکہ طریقت و شریعت میں ٹکراؤ نہ پیدا ہو اور مفاد و منفعت کے بجائے خسارہ و نقصان کا شکار نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ اس راہ کی دشواریاں بڑے بڑے صاحب عظمت بزرگوں کے پائے ہمت کے لئے تزلزل کا باعث بنی ہیں۔

درحقیقت یہ مسئلہ اظہار و بیان کا نہیں بلکہ عمل و محنت کا ہے اور وہ بھی کسی کامل کی دستگیری کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ یہاں ہوش و خرد کی دنیا سے بات نہیں ہوتی بلکہ وارفتگی اور ذوق کا عمل و مخلصانہ جذبات کام آتے ہیں اور عشق کی جولانیاں راہ نورد منزل بن جایا کرتی ہیں۔

حضرت امیر شریعت چونکہ ان کٹھن منازل کو طے کر چکے تھے اس لئے اس موضوع پر انہوں نے جو کچھ کہا وہ ان کے مشاہدہ کی بات ہے اور وہ صحیح طور رخ جاناں کی تصویر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مسلمان کی عقیدت و ارادت کا اگر کوئی گوشہ یا وجود اس دنیا میں باقی ہے تو وہ صرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس و مطہر ہے جس کے ذریعہ سے انسان کو اپنی حقیقت کا علم ہوا اور مقام ربوبیت کی شناسائی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس وجود گرامی کی تشریف آوری ان ہی تقاضوں کے سبب تھی۔ اسے تزکیہ نفوس کی ایسی قدرت ملی کہ انسان کی ضلالتیں رفع ہو کر رہ گئیں۔ اور راہ حق کی راہنمائی ہونے لگی۔ اس لئے ایسی ذات مقدس سے نسبت ارادت قائم کرنے اور وابستگی رکھنے کے لئے بھی ادب جمیل اور ہوش کامل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہاں پر تھوڑی سی لغزش گرفت و عتاب کا سبب بن جاتی ہے اور پھر عمر بھر کے لئے رسوائی و ذلت نامرادی و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے عارف رومی نے فرمایا تھا

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

اس ادب کو یوں تو ہر مسلمان ملحوظ رکھتا ہے لیکن جن لوگوں کو عشق کی خصوصی گرمی اور نعمت ملی ہے وہ اس منزل میں رہنے پہ اس قدر محاسبہ کرتے ہیں کہ حضور رسالت میں انہیں حواس کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ عقل و خرد کی تمام قوتیں مسلوب و عاجز ہو کر رہ جاتی ہیں ان کے قلوب کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی

ہیں اور ان کے رگ و پے میں احساس کی یہ آواز آنے لگتی ہے۔

عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ

ہم جب امیر شریعت کی ان نعتوں پر غور کرتے ہیں جو انہوں نے بارگاہ رسالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے تو ہمارا ذہن ان نفوس قدسیہ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ امیر شریعت بھی جناب رسالت میں اسی ادب و احترام کے پابند ہیں جو عارفین و کاملین کی زندگی کا خاصہ ہے اور جس کی بناء پر وہ بارگاہ نبوت میں شرف پذیرائی کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ آپ کی نعتوں کا انداز متقدمین کے انداز بیان و عقیدت سے اس قدر ملتا ہے۔ کہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نعت پر غور کیجئے کہ کس قدر متقدمین کے طرز کلام سے ملتی جلتی ہے۔

لولاک ذرۂ زجہان محمد است

سبحان من براہ چہ شان محمد است

جب دل کی گہرائیوں میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نقش دوام کی حیثیت اختیار کرتی ہے تو پھر روحانیت کی جلوہ پاشیاں بھی اسے اپنا مسکن بناتی ہیں۔ اس عالم میں جب کوئی وارفتہ محبت اپنے محبوب اور مقصود حیات کے اوصاف میں کچھ کہتا ہے تو اس کا بیان مشاہدۂ جمال یار سے خالی نہیں ہوتا۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے دید کی لذتوں سے سرشار ہو کر کہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں امیر شریعت کی ایک نظم جہاں ان کی الوہیت و عقیدت کے مقام کو نمایاں کرتی ہے وہاں ان کے اپنے مرتبہ کا بھی پتہ دے جاتی ہے۔ جس کا مطلع ہے کہ

ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش

جنوں ز سایہ زلف سیاہ می چکدش

امیر شریعت کی اس نعت سے ان کے ظرف بلند کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کس قدر جمال رسالت کے فریفتہ تھے۔

پچھلے اوراق میں ان کی پاک دامنی پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے نہ کہ افسانہ لیکن انہوں نے ذیل کے اشعار میں اپنی تر دامنی کا جس طرح سے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بندگی کو متاع حقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن کسی کے کرشمہ ناز اور نوازشہائے بے پایاں پر اس قدر بھروسہ ہے کہ یقین کامل کے ساتھ یہ پکار اٹھتے ہیں۔

نازنینان جہاں ناز فراموش شدند

کہ گدائے تو باانداز دگر می نازد

ناز دارد بہ در افشانیٔ خود ابر بہار

درد مند تو بناسور جگر می نازد

پارسایان ہمہ نازند بہ زہد و طاعت

یک ندیم است کہ بر دامن تر می نازد

مقطع کے شعر میں تر دامنِ تمنا ناز د سے حضرت ندیم کے اعتماد و یقین کی کئی داستانیں مرتب ہو سکتی ہیں اور بلا کسی خوف تردید کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی تردامنی ہی کو مایہ پذیرائی بنایا ہے۔ تا کہ غرور زہد و نخوت اتقا کے حملہ و غلبہ سے صلاحیت فطرت غارت نہ ہو سکے۔ ایسی تردامنی پر ہزار ہا تقویٰ و طہارت قربان ہوں جس کے ہوتے ہوئے منزل مراد حاصل ہو۔ کسی بدمست نے کیا خوب کہا ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اسی تردامن مرد کامل کی بے نیازی کا عالم ملاحظہ کیجئے۔ کہ خوان شاہی کے مقابلہ میں اپنی نان جویں پر کس قدر نازاں ہیں اور سایہ قد یار میں لمحہ بھر کی زندگی کو چتر شاہی سے ترجیح دیکر کس قدر فخر محسوس کرتے ہیں۔ انکا یار محبوب اور مقصود حیات کیسا حسن و خوبی کا سراپا ہو گا کہ حضرت ندیم دنیا کی ہر آسائش و راحت اور اعزاز کو اس کے مقابل ہیچ جانتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوازشہائے جاناں نے امیر شریعت کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس لئے وہ منت کش غیر نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی کا وقار و دبدبہ انہیں مرعوب کر سکتا ہے۔ فرمایا۔

یک نان جویں ز خوان شاہی خوشتر
از چنگ و رباب آہ صبحگاہی خوشتر
از تیر نگاہ زخم کاری دارم
خون جگرم زمرغ و ماہی خوشتر
یک لحظہ بزیر سایہ قد یار
واللہ۔ زہزار چتر شاہی خوشتر

دیکھا شیخ تردامن جب مستی میں آئے تو دعوی تردامنی بھول گئے اور اپنی آہ صبحگاہی کا اقرار و اعتراف کرنے لگے۔ جو ان کی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔ مقام پارسائی چھپانے سے نہیں چھپتا۔ عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید لوگ الزام تراشی کے دلدادہ ہیں وہ کسی کو رسوا اور بدنام کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے نفس میں بد اطوار کو تسکین اسی عمل سے ملتی ہے۔ ایک دور ایسا آیا کہ امیر شریعت کو وہابی، گستاخ، اور منکر ولایت کے الزام کا ہدف بنایا گیا اور ہمہ قسم ایسے ایسے الزام تراشے گئے کہ جن کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ آپ حالات کے اس دور میں بھی نہایت پامردی کے ساتھ خدمت دین انجام دیتے رہے۔ ہر صاحب و ولایت ان کے نزدیک واجب احترام اور لائق پیروی رہا۔ انہوں نے ہر سلسلہ کے بزرگ سے ارادت و عقیدت کے راستے تلاش کئے اور ان کے کمال عرفان کے گیت گانے لگے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم ان کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو انہوں نے چشتیہ سلسلہ کے ایک کامل بزرگ صاحب ولایت حضرت خواجہ غلام فرید چاچڑوی رحمتہ اللہ علیہ کی منقبت میں کہے ہیں۔ ان اشعار سے امیر شریعت کے عقیدہ ولایت پر واضح طور پر روشنی پڑتی ہے۔

گلشن عشق چشتیاں بہ طپید
شعلہ اش خواجہ غلام فرید
ہر کہ از عشق جرعہ نہ چشید
او چہ داند کہ چیست خواجہ فرید
مرغ فکرم زآشیاں بہ پرید
نالہائے فرید چوں بہ شنید
سرمۂ چشم شد بخاری را
خاک پائے غلام خواجہ فرید
حسرتے از دل ندیم نہ رخت
کہ نصیبش نہ شد نگاہ فرید

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد اب بھی کوئی یہ کہے کہ اسیر شریعت بزرگان دین اور اہل روحانیت کے منکر تھے تو یہ معترض کی بے بصری ہو گی۔ اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جن لوگوں نے عادتاً تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھ رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمیشہ کے لئے حقائق بینی سے محروم کر دیا ہے۔ اور ان کی فطرت بد نے انہیں گمراہی و ضلالت کے غار عمیق میں ایسا گرایا ہے کہ وہ سنبھل ہی نہیں سکتے۔ اور ان کی عقل اس قدر ماؤف ہو جاتی ہے۔ کہ وہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی صحیح فیصلہ کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ جو در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی گرفت ہے۔ عقل کا ماؤف ہو جانا یا حقائق کی تہہ تک نہ پہنچنا ایک ایسی نعمت سے محروم ہو جانا ہے جس کے بغیر تکمیل انسانیت قطعی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کوئی صاحب فہم اسے معقول تصور کر سکتا ہے۔

جنہیں اللہ تعالیٰ نے دولت عقل سے سرفراز کیا ہے وہ اختلاف اور معاندت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے حریف کے محاسن و خوبیوں کا اعتراف کیا کرتے ہیں اور یہی در حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے راست بازی کی علامت ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے انسان بہت سی لغزشوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد امیر شریعت اور ان کے ساتھیوں نے سیاست سے تو کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لیکن مرزائیت کے خلاف اپنی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ مذہباً اس کے خلاف تھے۔ کہ ایک اسلامی مملکت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل کسی کے دعوی نبوت کا پرچار ہو۔ جبکہ دنیائے اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔ کیونکہ حضور کی ذات مقدس خاتم النبیین ہے۔ چونکہ مرزا غلام قادیانی نے اس اصول دین کے برعکس دعویٰ نبوت کیا تھا اس لئے علمائے ربانی کو ان کے خلاف مذہبی جنگ لڑنی پڑ گئی ورنہ انہیں مرزا سے کوئی ذاتی کد و دشمنی قطعی نہ تھی۔ اس میدان کارزار میں امیر شریعت کی حیثیت قافلہ سالار کی تھی۔ انہوں نے مرزائیت کے خلاف آخر دم تک جنگ لڑی اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ شمع رسالت کے پروانے اور دین مصطفیٰ کے دیوانے اب بھی باقی ہیں جو عظمت دین اور عصمت رسول پر جان نچھاور کرنا جانتے ہیں۔

ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ امیر شریعت نے درد
دین اور عشق رسالت میں ناموس نبوت پر اپنی متاع حیات قربان کر دی اور برصغیر پاک وہند کو مرزائیت کے خطرہ سے خبردار کیا۔ ان کے اعضاء پر کہولت غالب آچکی تھی۔ عناصر میں اب وہ اعتدال کہاں کا رنگ نمایاں تھا۔ ذیابیطس جیسے موذی مرض نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن بایں ضعف و نقاہت بھی وہ مرزائیت کے خلاف خواجہ ناظم الدین کے دور حکومت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ پاکستان کا کونا کونا چھان مارا۔ اور اس جرم کی پاداش میں گرفتار ہو کر سکھر جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں صعوبت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ ان کا عشق رسول تھا اور یہ احساس دین کہ وہ حق کی خاطر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لے لیا کرتے تھے۔ ان کی سیاست ان کے دینی معاملات و امور کے تابع ہوا کرتی تھی۔ اور ان کی نظر میں محاسن دین کے علاوہ اور کوئی خوبی جچتی ہی نہ تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے میاں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کی راہنمائی فرمائی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی ہر طرح سے فلاح و بہبود موجود ہے۔ اس میں سیاست بھی ہے اور معاشرت کی مشکلات کا حل بھی۔ صرف میاں سے وابستگی چاہیئے۔

ترے نقش قدم کا ذرہ ذرہ
عبادت گاہ جان عاشقاں ہے

بعض شخصیتیں ایسی صفات خصوصیہ کا مجموعہ ہوتی ہیں کہ جن کی جاذبیت موافق و مخالف کو گرویدہ کئے رکھتی ہے۔ چنانچہ امیر شریعت کی شخصیت بھی انہی صفات کا خلاصہ تھی۔ ان کے حلقہ میں ہر طرح کے فکر و نظر کے لوگ جمع رہتے تھے۔ اور ارادت کا دم بھرتے حتیٰ کہ نیاز مندوں میں مسلمان ہندو کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی شامل تھے۔ گرچہ ہر ایک کی سیاسی و مذہبی راہ الگ الگ تھی لیکن وہ امیر شریعت کی محفل میں اس طرح سے جمے رہتے کہ ان کے چہرے بھی ان کے باہمی نظریاتی اختلاف کی غمازی نہ کرتے۔ امیر شریعت یوں تو ہر اختلاف کو گوارا کر لیا کرتے تھے لیکن کمیونزم کے بارے میں وہ بڑے شدید تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اسلام کے خلاف ایک نہایت ہی خطرناک اور لامتناہی سازش ہے۔ کیونکہ اس کا موجد کارل مارکس یہودی تھا۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ یہودیت نے اسلام کے خلاف ہمیشہ سازشوں کا جال بچھایا ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امیر شریعت نرے سیاسی نہ تھے بلکہ وہ ایک پکے مسلمان اور اسلامی روایات کے تابع انقلاب آفریں انسان تھے۔ اس لئے وہ کسی ایسی تحریک کو برداشت نہ کرتے تھے جس سے اسلام کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ حضرت امیر شریعت کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے حضرات سے یہ مخفی نہیں کہ انہوں نے پاکستان میں بھی مرزائیت کی پُرزور مخالفت کی چنانچہ تحریک تحفظ ختم نبوت نے زور پکڑا۔ ملک کے طول و عرض میں شیدایان رسالت ناموس نبوت پر جان کی بازی لڑانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ لاہور میں گولی چلی۔ لیکن اس پر بھی جذبہ عشق رسالت نہ دب سکا۔ ہر طرف سے مرزائیت کے خلاف احتجاجی جلوس نکلے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں آئی تو ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں حضرت امیر شریعت کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سال بعد رہائی ہوئی تو آپ کی صحت بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ خود

فرمایا کرتے تھے کہ سکھر جیل میں ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑا ہے۔ ادھر عمر بھی ستر کے قریب پہنچ گئی تھی اور ذیابیطس کی تکلیف ایک عرصہ سے بلائے جان بنی ہوئی تھی۔ باہر آنا جانا تقریباً معطل ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی متعلقین کے پیہم اصرار پر کسی نہ کسی جلسہ میں تشریف لاتے اور پرتاثیر خطابت سے عروق مردہ میں روح پھونک دیا کرتے کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ کیونکہ اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ سفر کی کوفت برداشت کرتے۔ البتہ ان کے مکان پر ہر وقت محفل جمی رہتی اور ان کا چہرہ سدا بہار پھول کی طرح شگفتہ و تابندہ رہتا۔ یہ ان کی فطرتی خصوصیت تھی کہ وہ بہزار رنج و محن بھی محفل احباب و ارادتمنداں میں ہنس کھ نظر آتے تھے۔

ضعف نے پہلے ہی سے وجود گرامی پر تسلط جما رکھا تھا۔ ہر چند ڈاکٹروں اور یونانی حکماء نے تدبیر علاج کی۔ مرض بڑھتا چلا گیا آخر ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء بروز دو شنبہ کو غروب آفتاب کے وقت آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ریڈیو پاکستان نے آپ کے وصال کی خبر نشر کی تو ملک کے طول و عرض میں غم و یاس کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے روز جنازہ اٹھا تو حد نگاہ تک لوگوں کا ہجوم سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آرہا تھا۔ لوگوں کی نواسنجیوں اور گریہ و زاری نے ملتان کے در و دیوار سے اظہار تعزیت کی۔ اخبارات نے ہائے اور وائے کی سرخیوں سے اپنے محبوب خطیب کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا جنازہ تھا جو اتنے ہجوم کے درمیان سے اٹھا اور لوگوں نے بصد خلوص خاطر کندھا دیا۔ حضرت سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے جو بات کہی تھی اور درس زندگی دیا تھا وہ حضرت امیر شریعت نے عملاً کر کے دکھا دیا۔

یاد داری کہ وقت زادن تو
ہمہ خنداں بودند و تو گریاں
ہمچناں زی کہ بعد مُردن تو
ہمہ گریاں بودند و تو خنداں

یہ کہہ رہے ہیں تجھ سے شہیدانِ راہِ عشق
تو دل کا خون کرلے محبت کا خوں نہ کر

شاہ جی کا آٹو گراف.....(شورش کاشمیری کے لئے)